مروجہ تصوف میں حضرت اشرف علی تھانویؒ کی اصلاحات

عبدالغفار پانیزئی*

ABSTRACT:

Mulana Ashraf Ali Thanawi most obvious contribution to the Muslim community of the subcontinent was his incredible output of literature on islamic subjects specially in Tasawwuf. There is no denying the importance of Mulana's written work. Yet of no less importance to the Muslims of subcontinent was mulana Thanawi's spiritual guidance. It had become a lamentable fact of life in India that tasawwuf had degenerated to such a degree that there was little to distinguish a yogi from a sufi.

Mulana Thanawi's contribution was to re-establish in the public mind the connection between Shari'a and tariqa. He accomplished to a certain extent in his writings. However, the real breakthrough in this potent field for the reform of the individual and society was made by Mulana Thanawi, the sheikh and murshid , not by mulana Thanawi, the auther and scholar.

In bringing the Islamic ideal of equilibrium to the field of spiritual guidance,mulana Thanawi' established a number of criterias for his disciples.It should be obvious that the rectification of inner conduct is essential. Yet , the problem is that inner elements are difficult to detect and , even if they are detected, it is no easy matter to prescribe a proper cure for them, In fact ,even if the cure were to be known, the taking of the medicine is nearly always distasteful. For these reasons an accomplished sheikh is required one who will be able to recognise and dignoses such spritual maladies and the prescribe for them the approprite cure. More over , the sheikh should have the power to create the ability to rectify himself/herself within his disciple. For this purpose,the sheikh will require the disciple to engage in certain spiritual exercises and disciplines.There for Hazart Thanawi explained Tasawwauf's every aspect in the light of Islami sharia, and socalled,sufies were defeated along with thair factities activities.

Keywords: Tasawwuf، Spiritual، Sufi، Shari'a and Tariqa, Sheikh and Murshid, Disciples, Rummage, Amendment, Contiguity, Allegian

تصوف

شریعت کا وہ جز جو اعمال باطنی سے متعلق ہے، تصوف وسلوک اور وہ جز جو اعمال ظاہری سے متعلق ہے، فقہ کہلاتا ہے۔اس کا موضوع، تہذیب اخلاق اور غرض رضائے الٰہی ہے اور اس کے حصول کا ذریعہ شریعت کے حکموں پر پورے طور سے چلنا ہے، گویا تصوف دین کی روح ومعنٰی یا کیف وکمال کا نام ہے۔جس کا کام باطن کو رزائل یعنی اخلاق ذمیمہ،

* متعلم ایم فل، علوم اسلامیہ جامعہ بلوچستان، کوئٹہ برقی پتا: agpanezai@gmail.com
تاریخ موصولہ: ۲/۲/۲۰۱۶ء

شہوت، آفات لسانی، غضب، حسد، وغیرہ سے پاک کرنا اور فضائل یعنی اخلاق حمیدہ، توبہ، صبر، شکر، خوف، رجا، زہد، توحید و توکل، محبت، مراقبہ، محاسبہ وتفکر سے آراستہ کرنا ہے، تاکہ توجہ الی اللہ پیدا ہوجائے۔ جو مقصود حیات ہے، اس لیے تصوف و طریقت، دین وشریعت کے قطعاً منافی نہیں بلکہ ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ صوفی بنے کہ اس کے بغیر فی الواقع ہر مسلمان پورا مسلمان کہلانے کا مستحق ہی نہیں رہتا۔(۱)

قدماء صوفیا نے تصوف پر جو کتابیں لکھی ہیں، مثلاً رسالہ قشیریہ امام قشیری، قوت القلوب، ابو طالب مکی، کتاب اللمعہ، ابو نصر عبداللہ بن سراج الطّوسی، فتوح الغیب، شیخ سہروردی، غنیۃ الطالبین، شیخ عبدالقادر جیلانی اور متاخرین میں تصانیف امام عبداللہ شعرانی، ان کو پڑھنے سے اس فن کی جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے افسوس کہ مصنوعی دوکاندار صوفیہ اور مبتدعین کی تلبیس نے اس پر ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ وہ بدعات کا مجموعہ بلکہ بطلان وضلالت کا ذخیرہ معلوم ہوتا تھا۔ اصل شئی جو اخلاص فی الدین، طلب رضاء حصول قرب، اور اعمال واخلاق ومقامات قلب ہیں۔ اور جن سے مقصود رزائل سے پاکیزگی اور فضائل سے آراستگی ہے تمام متروک ہوگیا تھا۔ صدیوں کے بعد حضرت تھانوی نے اس فن کو پھر سلف صالحین رنگ میں پیش کیا اور ہر قسم کے اضافوں اور آمیزشوں سے پاک کر کے کتاب وسنت کی روشنی میں پھر ظاہر کیا۔ اور زبان وقلم سے ان مسائل پر اتنا لکھا اور بیان فرمایا کہ اب طالب پر اصل طریق کا کوئی گوشہ اندھیرے میں نہ رہا۔

تصوف کی حقیقت سے ناآشنا لوگوں نے شریعت وطریقت میں تفریق کا مسئلہ گھڑا، اور اس زور سے اس کو شہرت دی کہ عوام تو عوام خواص تک بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے حالانکہ یہ تمام تر لغو اور خود ساختہ تھا۔ حضرت تھانویؒ نے تمام عمر یہی تلقین فرمائی کہ طریقت عین شریعت ہے، احکام الٰہی کی با اخلاص تمام تعمیل وتکمیل ہی کا نام طریقت ہے اور یہی خواص امت کا مذہب ہے، اور جس نے اس کے سوا کیا، وہ دین کی حقیقت سے جاہل اور فن سلوک ومسائل السلوک سے ناآشنا ہے۔

حضرت تھانویؒ نے فن سلوک میں مسائل السلوک، تائید الحقیقۃ اور التشرف وغیرہ کتب تالیف فرما کر مسائل سلوک کی قرآن وسنت کی روشنی میں تشریح فرمائی ہے۔ اہل تحقیق کے لیے اس فن شریف پر ایک جامع کتاب ''الکشف عن مہمات التصوف، تالیف فرائی، جو پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ حقیقت طریقت، حقوق طریقت، تحقیق کرامت اور دیگر مضامین تصوف پر مشتمل نہایت عجیب وغریب مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو مسائل سلوک میں جو خاص فہم وفراست ودیعت فرمائی تھی اس کے متعلق بطور تحدث نعمت حضرت فرماتے ہیں۔

جو خدا کی نعمت مجھ کو حاصل ہے اس کو بیان کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ تربیت باطن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بہت آسان طریق عنایت فرمائے ہیں نیز امراض باطن کی تشخیص میں اللہ تعالیٰ نے فہم عطا فرمائی ہے اس میں رائے بہت کم غلطی ہوتی ہے اور اکثر جو تجویز کیا جاتا ہے وہ صحیح ہوتا ہے اور نافع ہوتا ہے یہ سب حضرت حاجی صاحبؒ کی دعاؤں اور توجہات کی برکت ہے۔

آپ اپنے مرشد کامل حضرت حاجی صاحب کی طرف سے اجازت پا کر مسلمانوں کو تلقین وارشاد کے ذریعے ظاہری تعلیم

کے ساتھ باطنی تربیت وخلافت میں بھی لگے ہوئے تھے اور آپ کی توجہ باطنی سے تربیت حاصل کرنے والوں پر عجیب وغریب حالات طاری ہوئے تھے۔ آپؒ فن تصوف کے امام تھے، مجدد تھے، مجتہد تھے جو فن مدتوں سے مردہ ہو چکا تھا ان کے واسطہ سے پھر از سرنو زندہ ہوا، حضرتؒ فرماتے تھے کہ کوئی بھی مقصود ہو جب تک اس کو حاصل کرنے کے لیے صحیح ذرائع اختیار نہ کی جائیں مقصود کبھی حاصل نہیں ہوتا، تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس بھی دین کا ایک اہم اور بنیادی شعبہ ہے، اس کے حصول کے لیے بھی کتاب وسنت کے ضابطے اختیار کرنا ضروری ہے، بغیر اس کے مقصود کبھی حاصل نہیں ہو سکتا، میری نظر میں اس کی بڑی اہمیت ہے اور میری تعلیم وتربیت کا سارا دارومدار اسی پر ہے۔ میں طریق میں تہذیب اخلاق کو سب سے زیادہ مقدم سمجھتا ہوں چنانچہ جب اخلاق درست ہو جاتے ہیں تو اعمال خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔ اس لیے طالب وسالک میں پہلے ہی سے اس بات کی فہم پیدا کر دی جاتی ہے۔ حضرتؒ اکثر اس کی وضاحت فرماتے رہتے تھے کہ ذکر واذکار بے شک نہایت ضروری اور مفید امور ہیں۔ لیکن اخلاق وعمال کی خرابی ایسا حجاب ہے جو ان کے اثرات وانوار کو روح میں سرائیت کرنے سے روک دیتا ہے۔

اس لیے جب تک اصلاح اعمال نہ ہو اس وقت ذکر واذکار سے کوئی نفع نہیں ہوتا عام طور پر حقیقت ناشناس صوفیا ومشائخ کے یہاں اذکار واشغال ہی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اور اصلاح اخلاق واعمال کی طرف توجہ نہیں کی جاتی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سالک وطالب طریق حقیقت مقصود سے بے خبر رہ کر ہمیشہ احوال وکیفیات کے چکر میں سرگرداں اور رضائے حق سے محروم رہتا ہے۔ حضرتؒ نے اس دقیق اور اہم نکتہ سے اہل دل واہل نظر کو آگاہ فرمایا اور اس کو اپنا اصول تربیت قرار دے کر ہمیشہ طالبین وسالکین کو سب سے پہلے اپنے اخلاق واعمال درست کرنے کے لیے ہدایت وتلقین فرمائی، فرماتے ہیں کہ:

> ”کوئی ذکر وشغل کرتا ہو تو مجھے اس وقت تک قدر نہیں ہوتی، جب تک اس کے اخلاق واعمال درست نہ ہوں ذکر وشغل میں تو مزہ آتا ہے نہ کرے تو چین نہ آئے عمل تو وہ ہے جس میں نفس پر تنگی ہو پھر رضائے حق حاصل کرنے کے لیے اس عمل کو اختیار کرے، اس طرح چاہیے خود اپنے اوپر تکلیف اٹھالے مگر دوسرے کے حقوق ضرور ادا کرتا رہے“ (۲)

حضرت تھانویؒ نے جس طرح شریعت ظاہرہ جہالت وضلالت کی تاریکیوں سے نکالنے کا کام کیا، اسی طرح طریقت باطنہ کو بھی افراط وتفریط کی بھول بھلیوں سے نجات دلائی۔ آپ کی تجدید طریقت کا بڑا کمال یہ ہے کہ طریقت کو جو ایک زمانے سے صرف چند رسوم کا مجموعہ ہو کر رہ گئی تھی زوائد وحواشی سے پاک کر کے قدماء اور سلف صالحین کی راہ پر لے آئے آپ نے پورے شدومد کے ساتھ اس حقیقت کو ظاہر فرمایا، کہ طریقت عین شریعت ہے، شریعت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں، آپ کے یہاں طریقت کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں میں صحابہ کرام کا سا ذوق پیدا ہو جائے۔ آپ نے اس مقصد کے لیے سیرت سازی کا ایسا واضح طرز اختیار فرمایا کہ اسلامی روحانیت کا صحیح مفہوم لوگوں کی سمجھ میں آ گیا، یعنی شریعت ہی ساری دنیوی و اخروی اور ظاہری وباطنی سعادتوں کی کفیل ہے۔

حقیقت تصوف علم باعمل ہے!

ہمارے نزدیک حقیقت تصوف صرف علم باعمل ہے اور عمل وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے تعلیم فرمایا ہے اور جو سالک کے اختیار میں ہے اس کے علاوہ سب چیزیں زائد ہیں اگر وہ عطا ہو جائیں اور شیخ ان کو بتلا دے تو نعمت ہے، اور قابل شکر اگر عطا نہ ہوں یا حاصل ہو کر زائل ہو جائیں تو ان کی تحصیل کی فکر یا ان کی زوال پر قلق طریق میں ناجائز اور باطن کے لیے سخت مضر ہے۔ خواہ وہ کچھ ہی ہو۔ شیخ کو اطلاع تو سب حالات کی ضروری ہے اپنی رائے سے یا کسی خواب یا ارادے کی بنا پر کوئی کام کرنا طریق میں جائز نہیں، پھر اس اطلاع کے بعد شیخ تدبیر اس کی کرے گا جس کا تعلق امر و نہی سے ہو بقیہ کی تدبیر اس کے ذمہ نہیں اس لیے طالب کو اس کا مطالبہ یا انتظار بھی طریق میں ناجائز ہے اسی طرح اگر کوئی مرض یا کوئی اثر واقعی یا خیالی تکلیف دہ کوئی آفتِ داخلی یا خارجی، عارضی یا لازم ہو جائے اس کا تدارک بھی شیخ کے فرض منصبی کے حدود سے خارج ہے۔

فرمایا کہ طالب کے اندر اصلاح اعمال کا اہتمام پیدا کر دینے کے قبل اس کو اذکار و اشغال میں مشغول کر دینا اکثر مضر ثابت ہوتا ہے کیونکہ پھر وہ اپنے آپ کو بزرگ سمجھنے لگتا ہے، خاص کر اگر کہیں اتفاقاً اذکار و اشغال سے یکسوئی ہو کر اس پر کیفیات کا بھی ورود ہونے لگا تب تو گویا اس کے نزدیک بزرگی کی رجسٹری ہوگئی۔ حالانکہ اس قسم کی کیفیات کا بزرگی سے کیا تعلق، ایسی کیفیات تو بعض ریاضات اور مشق سے فساق و فجار بلکہ کفار تک کو حاصل ہو جاتی ہیں اور جب وہ ان کیفیات ہی کو بزرگی سمجھ لیتا ہے تو پھر اس کو اصلاح نفس اور اصلاح اعمال کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی نہ کبھی ادھر توجہ ہوتی ہے اس لیے ہمیشہ جہل ہی میں مبتلا رہتا ہے اور اصل مقصود یعنی وصول الی اللہ سے محروم رہتا ہے جس کا طریق تحصیل نصوص نے صرف اصلاح اعمال ہی کو بتلایا ہے۔ (۳)

تصوف نام ہے فقہ باطن کا

غرض تصوف یا علم باطن کی حقیقت صرف یہ ہے، کہ وہ ظاہر جسم یا جوارح کے اعمال و احکام اوامر و نواہی اور ان کی اصلاح و فساد کی فقہ کے بجائے نام ہے قلب و باطن کے امر و نواہی اور اس کی اصلاح و فساد کی فقہ کا، جس کے احکام کتاب و سنت دونوں میں اسی طرح منصوص ہیں، جس طرح فقہ ظاہر کے، اور جس کی اہمیت و اقدسیت قرآن و حدیث ہی کے اشارات و تصریحات سے ثابت ہے۔ (جس دن مال اور اولاد کام نہ آئیں گے مگر جو شخص اللہ کے پاس سلامت قلب لے کر آیا) اور حدیث میں اسی کی شرح و تفسیر یوں فرمائی گئی کہ خوب سمجھ لو کہ بدن کے اندر ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ سنورا اور بنا تو سارا بدن بن سنور جاتا ہے، اور اگر وہ بگڑا تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے، اور خوب سمجھ لو کہ وہ قلب ہے۔

یعنی ظاہر جسم کے اعمال و افعال کا بناؤ بگاڑ سے تمام تر اسی باطن قلب کے بناؤ بگاڑ پر موقوف ہے، اور تصوف یا فقہ باطن کا موضوع بحث اسی قلب کا بناؤ سنوار اسی کی سلامتی و صحت کی حفاظت، اور اسی کے بگاڑ یا فساد و بیماری کا علاج ہے۔

ایک بڑا مغالطہ

بڑے بڑے لوگوں کو یہ ہے کہ قلب و باطن کی جس صفائی و تزکیہ پر تصوف میں اس قدر زور ہے کہ گویا سارا تصوف یہی

ہے، وہ چونکہ غیر مسلم اشراقیہ اور خصوصاً خود ہندوستان کے جوگیوں میں بکثرت اور بڑے بڑے خوارق کے ساتھ پایا جاتا ہے، اس لیے ان کی بھی بہتوں نے صوفی ہی سمجھ رکھا ہے اور ''الصوفی لا مذہب لہٗ'' کا مشرب و مقام کسی خاص شریعت و مذہب سے اتنا وسیع اور بلند قرار دے دیا جاتا ہے کہ کفر و اسلام کی قید سے بھی آزاد ہو جاتا ہے، اس لیے متنبہ فرمایا کہ:

’تزکیہ وصفائی باطن اور تصوف کا اطلاق اس صفائی پر کیا جاتا ہے، جو شریعت کے احکام کی پابندی سے حاصل ہو، کیونکہ تزکیہ سے مراد وہ تزکیہ ہے، جو موجب فلاح ہے ''قد افلح من زکھا'' اور ظاہر ہے کہ فلاح منحصر ہے اتباع شریعت پر، پس ہندو جوگی وغیرہ جو ریاضت کرتے ہیں، دوسری صفائی ہی نہیں، یا لغوی معنی کے اعتبار سے اس کو صفائی کہو تو ساتھ ہی غیر مقبول کہنا ہوگا، اس صورت میں صفائی کی دو قسمیں ہوں گی، ایک مقبول دوسری مردود، عشق و محبت جو تصوف کی جان ہے اور جس سے تصوف کا سارا دفتر بھرا پڑا ہے، اور قلب و باطن ہی کی اعلیٰ صفت و کمال ہے، اس کی راہ بھی خود نص کتاب کی رو سے تمام تر اتباع سنت و شریعت ہے۔'' محبت خدا اور رسول جو منجملہ صفات حمیدہ قلبیہ اور اعلیٰ درجہ کی چیز ہے، اس کا تعلق بھی اتباع شریعت ہی سے ہے، بدون اتباع شریعت محبت کہا قال ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ دیکھو اس آیت میں اتباع رسول ہی کو ذریعہ محبت بتایا گیا ہے۔‘‘(۴)

تجدید تصوف کا اصل کارنامہ:

حضرت تھانویؒ کی تصوف میں تجدید و اصلاح کا اصل کارنامہ ظاہر و باطن یا شریعت و طریقت کی علمی و تعلیمی جامعیت ہے، یا وہی ''ملائیت و صوفیت'' کو ملا کر شیر شکر کر دینا، اور جس طرح تجدید کے ہر باب میں حضرت نے محض علم و اصول کی رہنمائی پر قناعت نہیں فرمائی بلکہ اپنی حدو استطاعت تک اس کو عمل میں لا کر دکھا دیا، اسی طرح شریعت و طریقت کی تعلیم و تدریس تالیف و تصنیف کے صدیوں سے الگ الگ علماء و مشائخ نے جو دو کیمپ قائم فرما دیئے تھے، ان کو خود اپنی ساری عملی زندگی اور ساری تقریری و تحریری خدمات میں از سر نو جسم و جان کی طرح ایسا ہم وجود بنایا، کہ دونوں میں امتیاز و جدائی داستان ماضی بن کر رہ گئی، مواعظ و ملفوظات تالیفات و تصنیفات سب میں دونوں رنگ سمو کر بالکل یک جان و ہم رنگ ہو گئے ہیں۔(۵)

اذکار و اشغال و مجاہدات

اذکار و اشغال، مجاہدات و مراقبات وغیرہ کے ایسے مروجہ طریقے جو بظاہر قرآن و حدیث میں مذکور یا ان سے ماخوذ نہیں معلوم ہوتے تو اس بارے میں حضرت مجدد کی تجدید و تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ تصوف کے دوست و دشمن، معتقد و منکر دونوں ایک مشترک غلطی میں پڑ گئے، کہ ان چیزوں کو تصوف کے مقاصد و غایات سمجھ لیا۔ حالانکہ ان کی اصل حیثیت تدابیر و مقدمات یا آثار و ثمرات کی ہے۔ مقاصد تصوف یہ چیزیں قطعاً نہیں، اس لیے ان کو بدعات کہنا سرے سے بے معنی ہے۔ بدعت نام ہے ''احداث فی الدین'' کا یعنی دین میں دین کا مقصد جان کر کسی نئی چیز کا اضافہ کرنا، نہ کہ احداث

للدین یعنی مقاصد دین کے حصول کے لیے تجربہ کی بناء پر کسی نئی تدبیر وادویہ کا تجربہ اوراضافہ ہوتا رہتا ہے، یا خود دین میں علوم دین کی حفاظت واشاعت کے لیے مدرسے کھولنا، کتب خانہ قائم کرنا، لیتھواورٹائپ میں کتابیں چھاپنا، درس وتدریس کے لیے نصاب تعلیم کی نئی نئی صورتیں تجویز کرنا امتحانی سند دینا ظاہر ہے، کہ یہ سب باتیں نئی یا احداث ہیں، لیکن چونکہ احداث للدین ہیں، اس لیے نہ بدعات ہیں، نہ ان کو کتاب وسنت میں ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔صوفیہ میں ایک خاص شغل پاس انفاس کا ہے، جو بہت عام ہے، اس کی نسبت کسی طالب کے سوال کے جواب میں فرمایا، کہ:

''یہ اشغال میں سے ہے، اس سے یکسوئی ہوتی ہے، اورخطرات دفع ہوتے ہیں، اسی طرح ذکر کے مختلف طریق ہیں، جس میں جس کو جمعیت ہو اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ جمعیت گو خود مقصود نہیں، لیکن مقدمہ ہے حصول مقصود کا، اور مقدمات کا مقصود میں بہت دخل ہوتا ہے، اس لیے مشائخ نے مقاصد کے لیے کچھ مقدمات تجویز کئے ہیں اوران کو عملاً ایسی ہی اہمیت دی ہے، جیسی مقاصد کو۔''

اس کے علاوہ مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں کہ

> ''غرض جتنے اشغال ہیں، وہ جمع خواطر ہی کے لیے ہیں، مقصود بالذات نہیں، اوراس میں مشائخ نے یہاں تک وسعت کی ہے، کہ بعض اشغال جوگیوں تک سے لیے ہیں، مثلاً حبس دم جوگیوں کے ہاں کا شغل ہے، مگر چوں کہ یہ ان کا مذہبی یا قومی شعار نہیں، اورخطرات کے دفع کے لیے نافع ہے۔اس لیےاس کو بھی اپنے ہاں لے لیا ہے، اوراس میں کچھ حرج نہیں نہ اس میں تشبہ ممنوع ہے کیونکہ جو کسی دوسرے فرقہ کا نہ قومی شعار ہو، نہ مذہبی، محض تدبیر کے درجہ میں اس کو تدبیر ہی کی حیثیت سے کسی نفع کے لیے اختیار کرنے میں کوئی محذور شرعی نہیں ہے، چونکہ حبس دم میں دفع خواطر کی محض ایک طبی تدبیر ہے اس لیے اس کا استعمال جائز ہے، کیونکہ یہ اخذ محض تدبیر میں ہے نہ کہ کسی مذہبی یا قومی شعار میں، اوراس کے جواز کی دلیل خندق کا واقعہ ہے، حضور ﷺ مدینہ طیبہ کو چاروں طرف سے محدود محفوظ فرمانا چاہتے تھے، حضرت سلمان فارسیؓ نے عرض کیا، کہ ہمارے ہاں فارس میں شہر کے گرد خندق کھودتے ہیں، چنانچہ حضور ﷺ نے حکم دے دیا کہ خندق کھودی جائے اور خود بھی بہ نفس نفیس کھودنے میں شریک ہوئے، تو یہ انتظام وتدبیر فارسیوں کا کوئی قومی یا مذہبی شعار نہ تھا، محض ایک تدبیر تھی، حضور ﷺ نے اس کی اجازت دے دی''۔(۶)

تجدید تصوف کے دو اصل اصول

حضرت کے تجدیدی واصلاحی تصوف کی اصل الاصول دو ہی باتیں ہیں، جن سے بچنے کا ہر وقت اہتمام ضروری ہے، ایک غفلت جس کا علاج ذکر ہے، جس کا اوپر بیان ہوا، دوسرے معصیت۔البتہ معاصی میں چونکہ عام دیندار اور علمائے ظا

ہر زیادہ تر کبائر اور وہ بھی جوارح کے معاصی کو ہی معاصی خیال کرتے ہیں، صغائر اور قلب یا باطن کے معاصی کی بالکل یا چنداں پرواہ نہیں کرتے اور صوفی کا خاص مقام احسان وحضور ہے، وہ صغائر وکبائر ظاہر وباطن ہر حال میں اور ہر جگہ حق تعالیٰ کو حاضر وناظر رائی ومرئی مشاہدہ کرتا ہے، اس لیے معصیت صغیرہ ہو یا کبیرہ، قلب سے ہو یا زبان سے یا ہاتھ پاؤں آنکھ کان سے سب سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، کیونکہ ''غفلت سے قلب کی نورانیت برباد ہوجاتی ہے، اور معصیت سے علاوہ نورِ قلب فوت ہونے کے مقبولیت عنداللہ بھی زائل ہوجاتی ہے اور یہ بڑا خسارہ ہے۔''

توجہ وتصرف

یہ نہ کوئی مقصود ماموراً مرہے' نہ فی نفسہ کوئی کمال وقرب اور نہ ولایت ومقبولیت کی کوئی علامت' بلکہ نفس وخیال کی ایک قوت ہے' جو خیال وتوجہ میں یکسوئی کی مشق سے مقبول کیا مردود سے مردود شخص حاصل کرسکتا ہے۔ پرانے زمانہ میں سحر یا جادوگری اور آج کل مسمریزم اور عمل تنویم (ہپناٹزم) کا بڑا مدار یہی ہے۔ اسی نفس یا باطن کی قوت سے کسی پر کوئی اثر ڈالنے کا نام صوفیوں کی اصطلاح میں توجہ وتصرف یا ہمت ہے۔ آپ فرماتے ہے کہ:

> ''اس قوت کا استعمال اگر کسی محمود یا اچھی غرض کے لیے ہو' جیسا کہ مشائخ کا معمول ہے تو اس غرض کے تحت اس تصرف کو بھی محمود سمجھا جائے گا' اور مقصود مذموم وبرا ہے' تو یہ تصرف بھی مذموم ہوگا۔ لیکن یہ قوت کوئی دینی کمال بہرحال نہیں' نہ مقبول ومقرب ہونے کی علامت ہے ہر فاسق وفاجر بھی مشق سے اپنے اندر یہ قوت پیدا کر لے سکتا ہے' بس جیسے ہاتھ پاؤں وغیرہ دوسری بدنی قوتوں کے استعمال کا حکم وحال ہے' وہی اس کا بھی ہے۔'' (۷)

اس حوالے سے دینی ودینوی مضرتیں بھی ہیں، خصوصاً اس زمانے میں حضرت تھانویؒ کا مشورہ اس کے ترک ہی کا ہے۔ دنیوی مضرتیں تو اس میں یہ ہے کہ اس کے استعمال کی کثرت سے عامل کے دماغی وقلبی قویٰ ضعیف ومضمحل ہوجاتے ہیں، جس کی وجہ سے بہت سے امراض پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ اور دینی مضرت یہ ہے کہ عوام اس کو ولایت وبزرگی کی علامت سمجھتے ہیں۔ جو اعتقادی ضرر ہے' اور مریدوں کا ضرر یہ ہے کہ وہ اکثر اسی پر قناعت کر بیٹھتے ہیں' اور اصلاح کا اہتمام چھوڑ دیتے ہیں' جو عملی ضرر ہے۔ ان ہی مضرتوں کی وجہ سے محققین نے اس کا استعمال چھوڑ دیا ہے' سلف کے زمانے میں یہ مضرتیں قویٰ کی مضبوطی' فطرت کی سلامتی اور خوش فہمی کے سبب موجود نہ تھے، یا بہت کم تھے۔

غایت بیعت

بیعت کا معاملہ بھی محض ایک خانقاہی رسم ہوکر رہ گیا تھا۔ حضرتؒ نے اس کی حقیقت اور اس کی اہمیت وضرورت خاص طور پر بڑی وضاحت کے ساتھ نمایاں فرمائی اور اس کے صحیح اصول پر تمام عمر عمل کر کے ہمیشہ کے لیے ایک مثالی معیار قائم فرمایا: حضرتؒ کا ارشاد ہے، لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جب تک ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت نہ کیا جائے صرف زبانی

معاہدے کو کافی نہیں سمجھا جاتا اگر کہا جائے کہ ہم تم کو تعلیم دیں گے اور ہر طرح تمہاری اصلاح کی تدبیر کریں گے تو اس پر کوئی راضی نہیں ہوتا، اس لیے جو موقوف علیہ نہ ہو اس کو موقوف علیہ سمجھنا یہ غلو فی العقیدہ ہے۔اس عقیدے کی اصلاح ہونی چاہیے، اس کے دو طریقے ہیں۔ایک یہ کہ اس طریقے کو اسی ہیئت سے جاری رکھا جائے اور زبان سے سمجھا دیا جائے کہ یہ ہاتھ میں ہاتھ دینا ظاہری بیعت ہے، اصل بیعت کام کرنا ہے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس ہیئت کو بالکل چھوڑ دیا جائے۔دوسرے حضرات پہلے طریقے پر عمل کریں اور مجھے چونکہ اس ہیئت خاصہ سے افراط فی الشفقت ہو جاتی ہے اس لیے میں دوسرا طریقہ اختیار کرتا ہوں اس طرح غلو فی العقیدہ کی بھی اصلاح ہو گئی اور ضرر کی بھی۔(۸)

عملی اصلاح

چونکہ آج کل بیعت کو عموماً لوازم طریق سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ اصل چیز استفاضہ ہے اس لیے حضرت اس غلو فی الاعتقاد کی اس طرح عملی اصلاح فرماتے تھے کہ اگر کوئی بیعت کی درخواست کرتا تو اول اس سے بیعت کی غایت دریافت فرماتے، یہاں تک کہ استفسارات ہی سے سمجھ کر وہ خود صحیح غایت بتا دیتا یا اپنے عجز کا اقرار کر کے خود حضرتؒ سے دریافت کرتا تو حضرتؒ خود اس کو صحیح غایت بتا دیتے، شروع میں اس لیے نہ بتاتے کہ جو بات خود مخاطب کی قوت فکریہ پر بوجھ پڑنے کے بعد سمجھ میں آتی ہے یا بتائی جاتی ہے وہ اس قدر پختگی کے ساتھ ذہن نشین ہوتی ہے کہ پھر کبھی نہیں بھولتی۔جب طالب کو غایت بیعت متعین ہو جاتی تو پھر فرماتے کہ یہ غایت تو بیعت پر موقوف نہیں یہ تو تعلیم و تعلم کے ذریعہ سے بھی حاصل ہو سکتی ہے اگر وہ کہتا کہ اس طرح شیخ سے مناسبت اور تعلق خاص پیدا ہو جائے اور عمل آسان ہو جائے تو پھر دریافت فرماتے کہ آیا صرف مرید ہی کو شیخ سے مناسبت ہو جانا کافی ہے یا اس کے علاوہ شیخ کو بھی مرید سے مناسبت ہونا ضروری ہے جب اس سے اقرار کرا لیتے کہ جانبین میں مناسب ہونا ضروری ہے تو فرماتے تو اس کے لیے تو صرف بیعت کافی نہیں بلکہ اور چند چیزیں بھی ضروری ہیں، مثلاً کچھ دن پاس رہنا خصوصیات مزاج کا تتبع اور ان کی رعایت کرنا کچھ عرصہ تک تعلیمی خط و کتابت جاری رکھنا وغیرہ، غرض جانبین کی مناسبت کے لیے صرف بیعت کافی نہیں بلکہ شیخ کو تو طالب کے ساتھ زیادہ تر اس کے برتاؤ سے مناسبت پیدا ہوتی ہے۔(۹)

تربیت کے چند اصول

طالبین طریق جو سلسلہ میں داخل ہونا اور بیعت ہونا چاہتے تھے ان کے متعلق حضرت والاؒ نے اپنے اصول و ضوابط کی اس طرح وضاحت فرمائی ہے۔فرمایا کہ جو شخص مجھ سے بیعت کی درخواست کرتا ہے اول تو میں اس کو دین کے ضروری مسائل کا علم حاصل کرنے کے لیے چند کتابیں پڑھنے کے لیے کہتا ہوں مثلاً قصد السبیل، بہشتی زیور اور مواعظ و ملفوظات کو تاکیداً مطالعہ کے لیے کہتا ہوں اور اس سے بہت نفع ہوتا ہے اور اس سے طالب کو بیعت کی غایت معلوم ہو جاتی ہے، اگر کوئی شخص یہ لکھتا ہے کہ ہم نے کتابیں پڑھی ہیں، تو میں لکھتا ہوں کہ پڑھ کر اپنی حالت میں کیا تغیر پیدا کیا اس طریقے سے وہ نفع ہوتا ہے جو برسوں کے مجاہدے سے بھی نہیں ہوتا میں تو اول ہی روز سے کام میں لگا دیتا ہوں مگر لوگ قدر نہیں کرتے،

اصل چیز فکر ہے جب آدمی فکر میں پڑتا ہے تو راستہ تلاش کرتا ہے، بس میں اول ہی گفتگو یا خط وکتابت میں طالب کے سر پر بوجھ رکھ دیتا ہوں جس کی وجہ سے اسے فکر پیدا ہو جاتی ہے اس فکر کی وجہ سے راستہ خود بخود منکشف ہونے لگتا ہے۔فرمایا طالب علموں کو وصیت کرتا ہوں کہ درس وتدریس پر مغرور نہ ہوں اس کا کارآمد ہونا موقوف ہے اہل اللہ کی خدمت صحبت اور نظرِ عنایت پر اس کا التزام نہایت اہتمام سے رکھیں۔ (۱۰)

تربیت گاہِ باطن

حضرتؒ کی باطن میں نہ کیفیات وذوقیات تھیں نہ وجد وحال، نہ رسمی مجاہدے تھے نہ مراقبے بس اہتمام تھا تو شریعت کے احکامات کی بجا آوری کا تھا۔ دھن تھی تو اپنے ہر انداز زندگی میں اپنے محبوب محسن انسانیت ﷺ کے ہر انداز زندگی کی اتباع کی تھی فکر تھی تو نفس وشیطان کے مکائد سے بچنے کی تھی اور تاکید تھی تو صرف یہ تھی کہ اپنے ظاہر کو بھی پاک وصاف رکھو اور اپنے باطن کو بھی طاہر وطیب رکھو۔ اگر ان باتوں کی توفیق نصیب ہو جائے تو سمجھ لو کہ دونوں جہاں کی دولت ہاتھ آ گئی۔ سالکین کو اس کی بھی تاکید کی جاتی تھی کہ منجملہ حقوق طریق کے یہ بھی لازم وواجب ہے کہ حقوق العباد کا حدود شرع کے اندر خیال رکھا جائے ماں باپ کے حقوق، بیوی بچوں کے حقوق، عزیز واقارب کے حقوق، دوست واحباب کے حقوق، اہل تعلقات کے حقوق ادا کرنا محض نوافل واوراد ووظائف کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ان میں کوتاہی کرنے سے مقصود طریق کبھی حاصل نہیں ہوسکتا، کیونکہ خدا کی مخلوق کو ناراض کر کے خالق کو راضی کرنا ناممکن ہے۔

حقوق العباد کا ادا کرنا فرض وواجب ہے ان کے ترک سے موخذہ ہوگا، اور ترک وظائف پر کوئی مواخذہ نہیں، یہ تو مستحب ہے، تو جو کام ضروری ہے اس کو ترک کر کے غیر ضروری کام کو ضروری اور اس پر کامیابی کا دارومدار سمجھنا محض خوش فہمی اور جہالت ہے اور انجام کار گمراہی اور نامرادی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں میں اعمال واجبہ کی وہ وقعت وعظمت نہیں جو غیر واجبہ کی ہے، نوافل ووظائف کی کثرت کو زیادہ موجب قرب سمجھتے ہیں، اور دوسروں کی حق تلفی نہ کرنا اور کسی کو اذیت نہ پہنچانا اس کو موجب قرب نہیں سمجھتے۔ اعمال واجبہ کو حقیر سمجھنے کا سبب، ان اعمال کا عموم ہے کہ اس کو تو سب ہی کرتے ہیں، پھر ان میں خصوصیت ہی کیا ہے کوئی خاص امتیازی بات ہے نہیں، ان میں حصول ولایت وقطبیت وغوثیت کی کون سی بات ہے۔ان میں سوز وساز ہے نہ کیفیات نہ وجد نہ حال، کس قدر افسوسناک یہ انداز خیال ہے اور محض باطل ہے۔

حضرتؒ اپنی مجالس میں بڑی اہمیت کے ساتھ آداب معاشرت بتایا کرتے تھے، فرماتے تھے کہ یہ کوئی اپنی پسند کی چیز نہیں ہے کہ جو دل چاہا اپنی مرضی کے مطابق معاشرہ اختیار کرلیا، کتاب وسنت میں اس کے آداب وحدود بھی مقرر کیے گئے ہیں۔اس میں بھی جائز وناجائز ہے حلال وحرام کا تعلق ہے اس لیے جو عمل خلاف دین ہوگا ضرور قابل مواخذہ ہوگا۔

موجودہ تہذیب وتمدن میں مزاج ایسے بدل گئے ہیں کہ عوام تو کیا خواص کو بھی اس طرف التفات نہیں لیکن سالک کے لیے یہ بات بڑے خسران کی ہے کہ دین کے اس اہم شعبہ کو نظر انداز کیا جائے۔اس خلاف ورزی کا مرتکب ہوتے

ہوئے رضائے حق جو مقصود طریق ہے کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔ حضرتؒ نے متعدد وعظ اس موضوع پر فرمائے ہیں اور چند کتابیں اس مضمون پر تالیف فرمائی ہیں حضرتؒ سالکین اور زیر تربیت اشخاص کو بڑی اہمیت کے ساتھ اس بات پر توجہ دلاتے کہ تعلقات میں اپنا جو معاملہ یا برتاؤ دوسرے کے لیے باعثِ اذیت ہو یا اس کی ناگواری کا سبب ہو وہ طریق میں سخت قسم کا سدراہ ہے کسی کو اپنی ذات سے ادنیٰ ناگواری بھی نہ ہو اس کا خیال رکھنا ہر شخص پر واجب ہے اور یہی حاصل سلوک ہے۔(۱۱)

استخفاف عمل کی غلطی

معتقدین نے تو عشق و محبت، قرب و معیت، وجودیت و عینیت وغیرہ کی فنی اصطلاحات کے معنی بزعم خود خدا جانے کیا کیا قرار دے لیے کہ معاملات و معاشرت اور اخلاق کے دینی احکام و اعمال کا ذکر ہی کیا صوم صلوٰۃ وغیرہ عبادات تک کا ان کے قلب میں استخفاف پیدا ہو گیا پھر بعض بزرگوں کے ہاں کسی غلبہ حال یا عذر خاص کی بنا پر اعمال کے اہتمام میں اگر کچھ کمی دیکھی تو اس حال یا عذر کو تو سمجھے نہیں، الٹے حیلہ جو نفس کے فریب میں آکر اس مغلوبیت و معذوری ہی کو عین کمال سمجھ لیا، جس کی نقالی میں دین و دنیا دونوں سے مارے گئے۔

عمل صالح کی تکمیل ہی تصوف ہے

لیکن شریعت اسلام جس طرح صرف صوم و صلوٰۃ کے احکام و اعمال کا نام نہیں، اسی طرح اس کا تصوف نرے گیان دھیان یا اذکار و اشغال ریاضات و مراقبات کا نام نہیں۔ وہ نام ہے انفرادی و اجتماعی زندگی کے سارے شعبوں سے متعلق اعمال و احکام کا، اور حضرت کی تجدید دین کا جس طرح بڑا کارنامہ یہ ہے کہ عبادت و ریاضات، معاملات و معاشرت کے سارے شعبوں کو جامع و حاوی ہے، اسی طرح حضرت کی تجدید تصوف کا ماحصل شریعت کے ان تمام ظاہری و باطنی اعمال و احکام کی صاحب شریعت کی ہدایات و اشارات کے مطابق اصلاح و تکمیل ہے البتہ جس طرح شریعت کے ایک شعبہ فقہ کو خاص تعلق ظاہر و قالب کے اعمال و احکام سے ہے، اسی طرح شریعت ہی کے ایک دوسرے شعبہ تصوف کو باطن یا قلب کے اعمال و احکام یا اخلاق باطنہ سے خاص تعلق ہے، لیکن اعمال باطن کی اصلاح و تکمیل کے لیے اعمال ظاہر کی اصلاح و تکمیل نہ صرف ضروری بلکہ مقدم ہے۔(۱۲)

لہٰذا حضرت تھانوی کی تجدیدؒ تصوف میں سب سے زیادہ اہمیت اعمال خصوصاً اعمال قلب کو حاصل ہے، اور سارا سلوک حضرت کا ظاہر و باطن کے اعمال کی پوری جامعیت کے ساتھ تربیت و تہذیب ہے۔ اگر جدید اصطلاح میں کہا جائے، تو اصلاح نفس کے اس فن کو حضرت نے نفسیاتی طور پر اتنا سائنٹیفک یا مرتب و منضبط فرما دیا ہے، کہ کسی سالک کے لیے راہ میں کوئی پیچ و خم باقی نہیں رہ گیا، ہر راہ رو بے خطر شاہ راہ پر پڑ کر منزل مقصود کو پا سکتا ہے۔

کلیدی و بنیادی اصول

اس فن کے کل تین اصول ہیں (۱) مقصود و غیر مقصود کی تمیز (۲) اختیاری و غیر اختیاری کی تمیز اور (۳) طبعی و عقلی کی

تمیز، منزل مقصود صرف رضائے حق ہے اور اسکے اصولِ حصول کا راستہ ظاہر و باطن یا قلب و قالب کے اختیاری اور عقلی یعنی شریعت کے تکلیفی اعمال کا اتباع ہے، بالعموم لوگوں نے اختیاری اعمال کے بجائے غیر اختیاری احوال کو مقصود بنا اور بتا کر اوران کے حصول کے لیے غیر معمولی مجاہدات و ریاضات کی مشقت میں پڑا اور ڈال کر سیدھے سادے راستہ کو پر پیچ کر دیا ہے، حضرت نے ایسے ہی کسی غیر اختیاری کی فکر سے پریشان حال اور از خود گرفتار طالب کو تحریر فرمایا کہ:

'خود مشقت میں پڑنے کا شوق ہو تو اس کا علاج ہی نہیں، باقی راستہ بالکل صاف ہے کہ غیر اختیاری کی فکر میں نہ پڑیں اختیاری میں ہمت سے کام لیں اگر کوتاہی ہو جائے ماضی کا استغفار سے تدارک کر کے مستقبل کی تجدید ہمت سے کام لینے لگیں اور استعمال ہمت کے ساتھ دعا کا بھی التزام رکھیں اور بہت لجاجت کے ساتھ۔' (۱۳)

سب سے جامع و کامل تجدیدی خدمت

حضرت تھانویؒ کی سب سے جامع و کامل تجدیدی خدمت یہی ہے۔ کہ باطنی طب کو بھی حضرت نے وقت کے مزاج و مذاق کے موافق باقاعدہ مکمل و مدون فن بنا دیا۔ اور صرف نظری طور پر نہیں' بلکہ عملی رہنماء اور نسخہ نویس تک کے لیے ہزاروں صفحات کا مطبوعہ مطب اللہ تعالیٰ نے مریضوں اور مایوسوں کے لیے محفوظ فرما دیا جو اس عالمگیر دور غفلت میں بالکل غیبی نصرت ہے۔ حد اس غفلت کی یہ ہے کہ مشائخ تک نے اس حقیقت کو بھلا دیا ہے کہ ان کی اصل حیثیت امراض قلب کے طبیب کی ہے۔ اور پیر و مرید کا اصل تعلق معالج و مریض کا ہے۔

اختیاری و غیر اختیاری امور

مولانا تھانویؒ اپنے طریقۂ اصلاح و تربیت میں اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ جن چیزوں کا حصول اپنے اختیار میں نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑے بلکہ ان کاموں کی فکر کرنی چاہیے جو اپنے اختیار میں ہوں۔ اس کے اصول کو مولانا تھانویؒ نصف سلوک بلکہ کل سلوک قرار دیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان ہی کاموں کے کرنے کا حکم اور ان ہی امور کا ذمہ دار قرار دیا ہے جو انسان کے بس اور اختیار میں ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

''لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا''

(اللہ تعالیٰ کسی کو تکلیف نہیں دیتا ہے مگر اس کی طاقت کے مطابق) (۱۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کام کسی انسان کے بس ہی میں نہیں اللہ تعالیٰ اس کا حکم نہیں دیتے بلکہ اسی کام کا حکم دیتے ہیں جو انسان کے بس میں ہے۔

مولانا تھانویؒ اس اصول کو اس قدر وسعت دیتے ہیں کہ ہر کام میں وہ اس بات کو خود بھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ جو امور اختیاری نہیں ان کے پیچھے خود بھی نہیں پڑتے اور سالکین و مسترشدین کو بھی اپنے ملفوظات و مکتوبات اور مواعظ کے ذریعے ہدایت

کرتے ہیں کہ ان چیزوں کے پیچھے مت پڑو جو تمھارے اختیار میں نہ ہوں۔ اگر کوئی طالب اصلاح اپنی برائی بیان کر کے آپ سے اصلاح کا طالب ہوتا تو فرماتے کہ اس برائی سے رکنا تمھارے اختیار میں ہے یا نہیں؟ اگر اختیار میں نہیں ہے تو پھر کوئی موخذاہ نہیں ہے اور اگر اختیار میں ہے تو اپنے اختیار کو کام لاتے ہوئے ہمت سے کام لو اور اس سے رکنے کی کوشش کرو۔ مولانا کی اس تعلیم پر عمل کر کے انسان بہت سی ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے اور ایسا کبھی مایوس نہیں ہونے پاتا۔ (۱۵)

مولانا تھانویؒ سے جب دریافت کیا کہ ''بندہ کے افعال کو اختیاری کیوں کہا جاتا ہے جبکہ بندہ کا وہ اختیار حق تعالیٰ کے اختیار حق تعالیٰ کے اختیار کے تابع ہے تو بندہ پھر مختار کہاں رہا، لہٰذا بندہ کے افعال بندہ کے اختیار میں کیسے کہے جا سکتے ہیں؟

آپؒ نے ارشا فرمایا: ''قاعدہ ہے کہ فعل کی نسبت عقلاً علت قریبہ کی طرف کی جاتی ہے اور ان افعال کی علت اختیار عبد ہے اور اس اختیار کی علت حق تعالیٰ کا اختیار ہے تو اختیار حق ان افعال عبد کی قلت بعیدہ ہوئی اور علت قریبہ ان کی بندہ کا اختیار ہوا اس لیے افعال کو بندہ کے اختیار کی طرف منسوب کرنا صحیح ہوا'' (۱۶)

اسی طرح حضرت تھانویؒ نے اپنے حکیمانہ اصول کے ذریعے کہ غیر اختیاری امور کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے اور اختیاری امور پر عمل کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے طالبین اصلاح کے بہت سے روحانی و باطنی امراض کا علاج کیا اور بہت سے لوگوں کی اصلاح ہوگئی۔ نیز اسی اصول کے بنا پر بہت سی جزئیات اخذ کیں۔ ایک مجلس میں آپ نے فرمایا:

''انفعالات (یعنی کیفیت اس فعل کا اثر طبیعت پر ہونا) غیر اختیاری اور افعال اختیاری ہیں اور وہی اس طریق میں مطلوب ہیں۔ انفعالات مطلوب نہیں ان کی فکر میں پڑنا خود اپنے لیے پریشانی خریدنا ہے'' (۱۷)

اسی بنا پر ذاکرین و شاغلین کو نصیحت فرماتے ہوئے کہتے ہے کہ ''بعض لوگ ذکر و شغل کرتے ہیں اور کسی خاص حالت اور ثمرہ کے حاصل نہ ہونے پر جس کو غلط فہمی سے انہوں نے مقصود سمجھ رکھا ہے غمگین ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ اصل مقصود رضائے حق ہے جس کا طریق ذکر و اطاعت ہے جس کو یہ حاصل ہے سب کچھ حاصل ہے۔ تو ان کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ان کو ذکر اور اطاعت کی توفیق تو دی ہے''۔

حضرت حاجی صاحب سے کوئی خادم اس امر کی شکایت کرتا تو فرماتے کہ خدا تعالیٰ کا شکر کرو اس نے اپنا نام لینے کی توفیق تو دی ہے اور فرمایا کرتے کہ جس طاعت کے بعد پھر اس طاعت کی توفیق ہو تو یہ طاعت سابقہ کے قبول کی علامت ہے۔ تو قبول کتنی بڑی نعمت ہے''۔ (۱۸)

جتنا دین کامل اتنا لطف حاصل

اب اس مسئلہ میں کوئی شبہ نہ رہا کہ جتنا دین کامل ہوگا اتنی ہی لذت و لطف زندگانی میں ترقی ہوگی گو سامان زیادہ نہ ہو۔ لوگ آج کل سامان راحت کو مقصود کو سمجھتے ہیں۔ مثلاً کہ اگر کسی پر پھانسی کا مقدمہ قائم ہو جائے اور سامان راحت اس کے پاس سب کچھ ہو تو کیا اسے راحت ہوگی۔ ہرگز نہیں۔ اور ایک لنگوٹا بند بھی اس کے ساتھ قید ہوا ہو چند روز کے بعد رہا ہو

جائے گا تو گویا اس کے گھر میں سامان راحت کچھ نہ ہو مگر رہائی کی خبر سن کر اس کے ہاں کیسی عید آئے گی۔ معلوم ہوا کہ راحت اور چیز ہے اور سامان اور چیز ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس کے پاس سامان راحت ہو اس کو راحت بھی حاصل ہو اور نہ یہ ضرور ہے کہ جس کے پاس سامان راحت نہ ہو اس کو راحت حاصل نہ ہو۔

سامان راحت بالذات منافی راحت نہیں کے حوالے سے فرماتے ہے کہ ''میں سامان سے منع نہیں بلکہ دین کے برباد کرنے سے منع کرتا ہوں اگر دین کے ساتھ یہ سامان دنیا بھی ہو تو مذائقہ نہیں مگر دین کو برباد کر کے اس کو جمع کرنا سخت حماقت ہے۔ جس سے خاک راحت نصیب نہیں ہوگی، شریعت نے ضعفا کو سامان راحت جمع کرنے کی اجازت دی ہے۔ بلکہ بعض عارفین بھی کمزور طبیعت کے ہوتے ہیں وہ جمعیت قلب کے لیے کچھ سامان رکھتے ہیں۔ مثلاً کپڑوں کے چار جوڑے اور سال بھر کا اناج' سو دین کی نگہداشت کے ساتھ اس کا بھی مذائقہ نہیں۔ مگر عبدالدینار وعبدالدارہم ہونا برا ہے۔ اس کے لیے حدیث میں وعید وارد ہے۔ ''پس تین قسم کے لوگ ہوئے ایک تو کامل دیندار کہ دنیا سے کوئی تعلق نہیں' ایک کامل دنیادار۔ جو اسی میں منہمک ہے اور اسکی حالت استسقاء کے بیمار جیسی ہے جس کو پانی سے ایک منٹ صبر نہیں ہوتا' اسی طرح اس کو دنیا کی فکر سے کسی دم فرصت نہیں۔۔۔۔ اور ایک وہ شخص جو دین پر قائم ہے مگر حصول اطمینان کے لیے بقدر ضرورت سامان رکھتا ہے' یہ برا نہیں''۔ اس میں کلام نہیں کہ دین کے صحیح عقائد وتصورات خصوصاً یوم دین یا آخرت کے یقین واذعان کے ساتھ ظاہری سامان راحت ہو جب بھی' نہ ہو جب بھی' ہر حال میں دنیا کی زندگی یقیناً پر لطف ومزیدار ہی رہتی ہے اور دنیا کی ہر پریشانی ومصیبت کو دور یا ہلکا کرنے کا بہترین علاج آخرت کی راحت ومصیبت کا استحضار ہی ہے۔ لیکن آخرت کی مصیبت خود جو سب سے بڑی مصیبت ہے اس کا کیا علاج؟ اس مصیبت کے تصور واحضار کے بعد تو دنیا کی بڑی سے بڑی راحت تلخ ہو جانی چاہیے، وہی کہ اگر کسی کو پھانسی کا حکم مل چکا ہو' تو اس کو بادشاہت میں کیا راحت محسوس ہو سکتی ہے۔ یہ سب بالکل ہیچ ہے۔ اور سچ پوچھے تو مصیبت آخرت ہی کی مصیبت ہے دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کے آگے بے حقیقت ہے۔ جواب بالکل آسان ہے کہ وہاں کی مصیبت دنیا کی بیماری وآزاری دوستوں عزیزوں کی موت و زندگی وغیرہ کے اکثر مصائب اپنے اختیار سے باہر ہوتے ہیں نہ ان کا آنا اپنے اختیار میں نہ دور کرنا، بخلاف آخرت کی مصیبت کے کہ اس کا دور کرنا تمام تر اپنے اختیار میں ہے۔ اس لیے کہ اس کا مدار تمام تر معصیت سے اجتناب اور طاعت کے اہتمام پر ہے۔ اور ان دونوں چیزوں میں ہم سے مطالبہ یا ہم کو تکلیف صرف اسی قدر کی ہے جس قدر کہ ہماری طاقت و اختیار میں ہے' وہ بھی بقدر سہولت کے ساتھ۔ یہ نہیں کہ قمار وشراب کا ترک کھانے پینے کے ترک کی طرح ہماری طاقت سے باہر ہو' یا کذب وفریب' ظلم وجبر' بغض وعداوت کبر وغرور وغیرہ کوئی ایسی معصیت ہو جس کو سہولت یا بقدر تحمل مجاہدہ و کوشش سے چھوڑا نہ جا سکتا ہو۔ غرض اسی طرح اعمال صالحہ خواہ وہ صوم وصلوٰۃ کے عبادات ہوں یا بیع وشراء کے معاملات یا اخلاق ومعاشرت' ان میں سے کون سا شعبہ ہے جس کا ایک حکم بھی ہماری قوت وبرداشت سے باہر ہو، ایک نماز ہی کو لیجئے

کہ کھڑے ہوکر نہ پڑھ سکتے ہوں تو بیٹھ کر اجازت ہے، بیٹھنے کی قوت نہ ہو تو لیٹ کر، حرکت کی قوت نہ ہو تو اشارہ سے، پانی نہ ملتا ہو یا کسی مرض میں مضرت کا اندیشہ ہو تو تیمّم کی اجازت ہے، اور اس کا بالکل وہی حکم واجر ہے جو پانی سے وضو کا، حدیہ کہ کوئی شخص اپنی صحت وتندرستی میں نیکی واطاعت کے اعمال بجالاتا ہے، بیماری سے اگر معذور ہوجائے، تو بھی اجر کے اعتبار سے نامہ اعمال میں صحت وتندرستی ہی کے زمانے کے اعمال لکھے جاتے رہیں گے۔ لہذا معلوم ہوا کہ آخرت کی مصیبت سے بچنا یا وہاں کی راحت کا خریدنا، اس سے ارزاں وآسان تو دنیا کا کوئی حقیر سودا بھی نہیں۔ حق یہ ہے کہ وہاں کوڑیوں کے مول بادشاہت ملتی ہے وہی کہ ''نیم جان بستا ندوصد جان دہد'' اور یہاں کی بادشاہت بھی دردسر سے خالی نہیں رہا یہ احتمال کہ ایسا کون ہے جو تمام چھوٹی بڑی طاعات کا اہتمام کرسکے یا تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے محفوظ رہ سکے اور اوامر ونواہی کی کوئی کوتاہی نہ ہو حالانکہ وہاں تو ذرہ ذرہ نیکی وبدی کی جزاوسزا ملے گی۔ **''فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقا ل ذرۃ شرا یرہ''** پھر وہاں کی ذرہ سی مصیبت بھی یہاں کی بری مصیبت سے بری ہوگی۔ لیکن ساتھ ہی دوسرا قانون یہ بھی تو ہے **''ان الحسنا ت یذ ھبن السیئات''**(۱۹)

لہذا آپؒ نے تصوف کے ہر پہلو کو شریعت اسلام کی روشنی میں واضح فرمایا غیر محقق اور نااہل ارباب تصوف کے باعث اسلامی تصوف کی اصل حقیقت محض رسموں ریتوں میں مستور ہوکر رہ گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت تھانویؒ کے ذریعے دوبارہ اس کی اصل روح کو اجاگر فرمادیا۔

مراجع وحواشی

(۱) محمد مسیح اللہ شاہ۔ شریعت وتصوف۔ ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ۔ ص ۱۷

(۲) وکیل احمد شیروانی۔ (۱۹۹۵ء)۔ اشرف مقالات، لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس۔ ۴۷۸/۳

(۳) عزیز الحسن۔ (۱۴۲۷ھ)۔ اشرف السوانح۔ ملتان: تالیفات اشرفیہ۔ ۱۹۵/۱

(۴) عبدالباری ندوی۔ (۱۹۴۹ء)۔ تجدید تصوف وسلوک۔ لاہور، مکتبہ اشرفیہ۔ ص ۲۹ (۵) ایضاً۔ ص ۳۳

(۶) ایضاً۔ ص ۴۸ (۷) ایضاً۔ ص ۹۳ (۸) عزیز الحسن، اشرف السوانح، تالیفات اشرفیہ، ملتان، ۱۴۲۷ھ، ج،۱/ ۱۹۷

(۹) ایضاً۔ ص ۲۱۲ (۱۰) وکیل احمد شیروانی۔ (۱۹۹۵ء) (۱۱) ایضاً۔ ص ۴۹۳

(۱۲) عبدالباری ندوی۔ (۱۹۴۹ء)۔ ص ۲۰۲ (۱۳) ایضاً۔ ص ۲۱۴ (۱۴) سورۃ البقرہ: ۲۸۶

(۱۵) سید ابرار علی۔ حضرت تھانویؒ کا طریق اصلاح۔ لاہور: بیت العلوم۔ ص ۸۲

(۱۶) الافاضات یومیہ۔ ۱۰/ ۲۱۳، ملفوظ ۔ ۱۴۳ (۱۷) محمد شفیع مفتی۔ (۱۳۹۶ھ)۔ مجالس حکیم الامت۔ کراچی: دارالاشاعت۔ ص ۳۲۴

(۱۸) اشرف علی تھانوی۔ (۱۹۶۳ء)۔ مواعظ حسنہ، بعنوان ''دعا کے آداب''۔ دہلی: دینی بک ڈپو۔ ۵۲/۱، ۵۳

(۱۹) عبدالباری ندوی۔ (۱۹۴۹ء)۔ ص ۳۳۶